طارق ہاشمی*

اُردو شاعری میں حیوانات کے استعارے: ماحولیاتی تناظر

Animal Symbolism in Urdu Poetry: An Ecocritical Perspective

Abstract:

This paper examines animal symbolism in Urdu poetry through an ecocritical lens, arguing that literary representations often construct fixed cultural meanings that overshadow ecological realities. While animals have long served as metaphors for human emotions, ethics, and social behaviours, these symbolic associations can become reductive when they detach from the biological and environmental significance of the creatures themselves. The study situates this discussion within a broader intellectual tradition, drawing on classical insights as well as modern ecological thought. Focusing on selected animals such as vultures, frogs, snakes, bats, and owls, the paper demonstrates how Urdu poetry frequently associates them with negative qualities like greed, deceit, impurity, fear, and decay. In contrast, contemporary ecological science highlights their essential roles in maintaining environmental balance–ranging from disease control and pest regulation to pollination and bioindication. This contrast reveals a gap between cultural imagination and scientific understanding, raising important questions about the impact of inherited metaphors on environmental perception. The study argues that the issue lies not in symbolism itself but in its uncritical perpetuation. It calls for a re-evaluation of traditional metaphors in Urdu poetry, advocating for a more dynamic literary approach that remains sensitive to ecological knowledge. Such a shift can help align cultural expression with environmental awareness, ultimately contributing to a more balanced and responsible relationship between humans and the natural world.

Keywords: Modern Urdu Ghazal, Elegy, Climate change, Ecological consciousness.

انسان اور فطرت کا رشتہ محض بقا کا نہیں بلکہ معنی سازی (meaning-making) کا بھی ہے۔ انسان نے اپنے گرد موجود جانوروں اور پرندوں کو صرف جان دار نہیں سمجھا بلکہ انھیں اپنی تہذیبی، اخلاقی اور نفسیاتی کیفیات کے استعارے کے طور پر بھی برتا ہے۔ یہی عمل آگے چل کر علامت سازی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ انسان کی اس علامت آفرینی میں اس کی تخلیقی حس، اس کی اجتماعی

یادداشت اور اس کے تہذیبی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ یوں فطرت کی مخلوقات انسانی شعور میں ایک وسیع معنوی کائنات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ علامتیں جامد ہو جائیں اور فطرت کی سائنسی و ماحولیاتی حقیقت ان کے نیچے دب جائے۔

انسانی تہذیب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف معاشروں نے جانوروں اور پرندوں کو اپنے فکری اور اخلاقی نظام کا حصہ بنایا ہے۔ کہیں شیر شجاعت کی علامت بنتا ہے، کہیں لومڑی مکر و فریب کی، کہیں کبوتر امن کی اور کہیں عقاب بلند پروازی کی۔ اس طرح فطرت کے جان دار انسانی تخیل میں محض حیاتیاتی وجود نہیں رہتے بلکہ ایک علامتی زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ادب، اساطیر، مذہبی روایتوں اور لوک داستانوں میں یہ علامتی استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ تاہم جب یہ علامتیں حقیقت سے کٹ کر مستقل اور جامد معنی اختیار کر لیتی ہیں تو وہ فطرت کے حقیقی اور سائنسی فہم کو پس منظر میں دھکیل دیتی ہیں۔

حیوانات کیا ہیں، ان کا وجود کیا معنی رکھتا ہے اور ان کی فطرت کے کیا کیا رنگ ہیں؟ ان سوالات پر عہدِ قدیم سے غور کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یونانیوں نے باقاعدہ علمی بنیادوں پر مطالعہ کیا۔ ارسطو کی کتاب *History of Animals* قدیم دنیا میں حیوانات کے منظم سائنسی مطالعے کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ ارسطو نے حیوانات کو محض علامتی یا اخلاقی مثالوں کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ ان کا مشاہدہ کر کے ان کی درجہ بندی، جسمانی ساخت اور طرزِ زندگی کو بیان کیا۔ ان کے نزدیک جانوروں کے درمیان اختلافات کو سمجھنے کے لیے ان کی عادات، خوراک اور جسمانی اعضا کا مطالعہ ضروری ہے۔ ارسطو کے مطابق:

> اکثر جانوروں میں نرمی یا درشتی، جرأت یا بزدلی جیسے نفسیاتی اوصاف کے نشانات پائے جاتے ہیں۔[1]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ارسطو جانوروں میں صرف حیاتیاتی خصوصیات ہی نہیں بلکہ نفسیاتی خصوصیات کی جھلک بھی دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی فکر بنیادی طور پر سائنسی اور مشاہداتی ہے، لیکن ان کے ہاں حیوانات کو محض بے شعور مخلوق قرار نہیں دیا گیا بلکہ ان میں بعض نفسیاتی اور سماجی خصوصیات کو تسلیم کیا گیا ہے۔ علمی روایت میں اس موضوع کو سب سے نمایاں طور پر الجاحظ نے آگے بڑھایا۔ ان کی تصنیف کتاب الحیوان حیوانات پر ایک وسیع علمی و ادبی مجموعہ ہے جس میں مشاہدات، حکایات، اشعار اور فلسفیانہ نکات سب شامل ہیں۔ الجاحظ حیوانات کی بقا، ماحول اور باہمی تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہر حیوان اسی جگہ میں زندہ رہتا ہے جو اس کے موافق ہو؛ جب اس کا ماحول بدل جاتا ہے تو حالت بھی بدل جاتی ہے، اور کبھی وہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔[2]

الجاحظ کے ہاں حیوانات کا مطالعہ صرف حیاتیاتی نہیں بلکہ ماحولیاتی اور سماجی پہلو بھی رکھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جانوروں کی چالاکی، ان کی بقا کی حکمت عملی اور ان کے باہمی تعلقات پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ارسطو

کے سائنسی مشاہدے کو ایک ادبی اور فکری وسعت عطا کی۔

اس فکری سلسلے کا تیسرا اور سب سے منفرد مرحلہ اخوان الصفا کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان رسائل میں ایک مشہور حصہ رسالۃ الحیوان ہے جس میں جانوروں اور انسانوں کے درمیان ایک علامتی مقدمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں حیوانات انسانوں کے ظلم کے خلاف فریاد کرتے ہیں اور انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس تصوّر کی جھلک ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ہم بھی تمھاری طرح امتیں ہیں، ہماری اپنی حالتیں اور اخلاق ہیں، اور ہم میں سے ہر گروہ کے لیے ایک نظم و تدبیر ہے، ہم ویسے نہیں ہیں جیسے تم سمجھتے ہو۔[۳]

جانوروں کی زبانی یہ خیال، اخوان الصفا کی فکری جہت کا نہایت گہرا اور انقلابی اظہار ہے۔ اس ایک جملے میں حیوانات کو محض فطری یا حیاتیاتی مخلوق نہیں بلکہ ایک اجتماعی، اخلاقی اور شعوری وجود کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ''اُمم'' (امتیں) کا لفظ خاص طور پر معنی خیز ہے، کیوں کہ یہ حیوانات کو انسانی سماج کے برابر ایک منظم اور بامقصد اجتماعی وجود عطا کرتا ہے۔ اس طرح اخوان الصفا کا یہ رسالہ انسان اور حیوان کے درمیان قائم روایتی درجہ بندی (hierarchy) کو چیلنج کرتا ہے اور یہ تصوّر پیش کرتا ہے کہ عقل و شعور صرف انسان تک محدود نہیں۔ یہ انداز دراصل ایک اخلاقی مکالمہ (moral discourse) کی بنیاد رکھتا ہے، جہاں حیوانات اپنے حقوق اور شناخت کا شعوری اظہار کرتے ہیں اور جدید مباحث جیسے مابعد بشریت (posthumanism) اور حیواناتی اخلاقیات (animal ethics) کی پیش بندی بھی کرتا دکھائی دیتا ہے، جہاں غیر انسانی وجود کو بھی اخلاقی دائرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

جدید دور میں حیاتیات، ماحولیات اور سائنسی تحقیق نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جانوروں اور پرندوں کی اپنی پیچیدہ حیاتیاتی اور ماحولیاتی حیثیت ہے جسے محض انسانی اخلاقی یا نفسیاتی علامتوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کی ہر مخلوق ایک مخصوص ماحولیاتی نظام کا حصہ ہے اور اس کی اپنی داخلی منطق اور بقا کی حکمت عملی ہوتی ہے۔ اس تناظر میں ضروری ہے کہ ہم علامت سازی کی ادبی اور تہذیبی روایت کو سمجھتے ہوئے فطرت کی سائنسی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں۔ بصورت دیگر انسان کی بنائی ہوئی علامتیں فطرت کی اصل معنویت پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور انسان و فطرت کے حقیقی تعلق کو محدود کر دیتی ہیں۔

برصغیر سمیت دنیا کی بیش تر ثقافتوں میں کئی ایسے جانور اور پرندے ہیں جو ماحولیاتی نظام کے لیے نہایت مفید اور ناگزیر ہیں، مگر ہماری اجتماعی یادداشت میں وہ نحوست، کراہت، مکاری یا خوف کی علامت بن چکے ہیں۔ عالمی ادب میں کئی ایسے جانور اور پرندے ملتے ہیں جنھیں انسانی تصوّر میں اکثر منفی رنگ دیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی ادب میں بھی کئی جانور اور پرندے منفی یا خوفناک صفتوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ اکثر حیوانات کو موت، بربادی یا بدقسمتی کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور ان کی

موجودگی کو انسانی زندگی میں خطرہ یا آزمائش کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض حیوانات تمثیلی اور علامتی طور پر ایسے دکھائے گئے ہیں، جہاں انھیں شیطنت، فریب یا انسانی غلطیوں کی نشان دہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض چھوٹے پرندے کبھی مزاحیہ مگر غیر قابل اعتماد مخلوق کے طور پر آئے ہیں، جو کرداروں کی کمزوری یا لغزشوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یوں ادب میں ان کی موجودگی صرف حقیقت کی عکاسی نہیں بلکہ علامتی اور اخلاقی پیغام کا حصہ بنتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری ثقافتی علامتیں ماحولیاتی شعور کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہیں؟ اور کیا ادب، تعلیم اور سماجی بیانیہ ان بدنام مگر مفید جانداروں کے حوالے سے کوئی نیا زاویۂ نظر تشکیل دے سکتے ہیں؟

مذکورہ سوالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اردو شاعری میں کرگس ایسا پرندہ ہے جس کے بارے میں انتہائی منفی تاثر پایا جاتا ہے۔ گدھ شاید دنیا کا سب سے زیادہ غلط سمجھے جانے والا پرندہ ہے۔ اس کا گنجا سر، ساکت پرواز اور مردار پر انحصار اسے نفرت انگیز بنا دیتا ہے۔ اردو شاعری میں گدھ حرص، اخلاقی زوال اور مردہ ضمیری کا استعارہ بن چکا ہے۔ خصوصاً ہمارے قومی بیانیے میں شاہین کی تحسین کے مقابلے میں کرگس کی کرداری صفات تو نہایت منفی پیرائے میں ظاہر کی گئیں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور[۴]

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے، رہ و رسمِ شاہبازی[۵]

ماحولیاتی نظام کے حوالے سے دیکھا جائے تو گدھ ایک نہایت اہم اور ناگزیر کردار ادا کرنے والے پرندے ہیں، یہ فطرت کے "صفائی کرنے والے" (natural scavengers) ہیں، جو مردہ جانوروں کو کھا کر ماحول کو آلودگی سے بچاتے ہیں۔ جب کوئی جانور مر جاتا ہے تو اس کا جسم گلنے سڑنے لگتا ہے اور اس میں خطرناک بیکٹیریا اور جراثیم پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن گدھ ان مرداروں کو تیزی سے ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے معدے میں موجود تیزابیت اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ وہ راج پھوڑا (anthrax) اور rabies جیسے مہلک جراثیم کو بھی ہضم کر سکتی ہے، یوں یہ پرندے بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماحولیاتی استحکام کے سلسلے میں ایک مضمون میں گدھوں کے کردار کے بارے میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گدھ عالمی سطح پر نہایت اہم ماحولیاتی خدمات (ecosystem services) فراہم کرتے ہیں، لیکن ان خدمات کی قدر اور سائنسی تفہیم کے درمیان ایک نمایاں خلا موجود ہے۔ مطالعے کے مطابق گدھوں کا سب سے اہم کردار تنظیمی و حفاظتی خدمات (regulation and maintenance

services) میں ہے، جن میں مردار کی صفائی، بیماریوں کی روک تھام، اور ماحولیاتی توازن کا قیام شامل ہے۔ اس کے علاوہ گدھ بعض ثقافتی اور سماجی پہلوؤں سے بھی جڑے ہوئے ہیں، تاہم ان پہلوؤں پر تحقیق نسبتاً کم ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ:

> گدھ ماحولیاتی نظام کی تنظیم اور دیکھ بھال سے متعلق خدمات کے ساتھ مضبوط طور پر وابستہ ہیں، تاہم ان خدمات کے مختلف زمروں کے حوالے سے سائنسی شواہد کی مضبوطی یکساں نہیں بلکہ مختلف ہے۔[۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہرین کی بڑی تعداد گدھوں کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، لیکن مختلف خطّوں اور شعبوں کے ماہرین کے درمیان اس اہمیت کے اندازے میں فرق پایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ گدھوں کے کردار کو اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) سے بھی جوڑا جا سکتا ہے، خاص طور پر صحت، ماحولیاتی تحفظ اور پائیداری کے حوالے سے۔ اس کے باوجود، بہت سی ماحولیاتی خدمات کے بارے میں سائنسی شواہد ابھی ناکافی یا غیر مساوی ہیں، جس کی وجہ سے ان کی قدر کا مکمل ادراک نہیں ہو پاتا۔ گِدھوں کی بقا صرف حیاتیاتی تنوّع (biodiversity) کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک وسیع تر انسانی و ماحولیاتی مفاد کا تقاضا ہے اور ان کے کردار کو بہتر طور پر سمجھنے اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ امر لائقِ ذکر ہے کہ برصغیر میں جب ڈائکلوفیناک (Diclofenac) جیسی دواؤں کے باعث گدھوں کی تعداد میں شدید کمی آئی تو ریبیز اور آوارہ کتوں کی آبادی میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا۔ یہ صورتِ حال اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ گدھ کی عدم موجودگی انسانی صحت کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔

اردو کی صوفیانہ شاعری میں من کی صفائی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ واضح کرنے کے لیے کہ محض تن کی صفائی کافی نہیں، بابا فرید گنج شکر کا ایک شعر اکثر نقل کیا جاتا ہے:

تن دھونے سے من جو ہوتا پوک
پیش رَو اصفیاء کے ہوتے غوک

یعنی محض تن دھونے سے پاکیزگی ملتی تو مینڈک اہلِ صفا کے رہنما ہوتے۔ یہ شعر ہماری اس روایتی فکر کا عکاس ہے جس کے مطابق مینڈک ایک کراہت انگیز اور غلاظت کا مرقع جانور سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایسا غیر پرکشش اور بھونچال انگیز جانور جو بدصورت اور تیز آواز کا حامل ہے۔ یہی وہ تصوّر ہے جو ہمیں اردو شاعری میں مختلف پیرایوں میں نظر آتا ہے۔

میں چھوڑ آیا ہوں پیچھے ہزارہا مینڈک
سخن سرائی کے تالاب سے گزرتے ہوئے[۷]

زباں کی نہر سے غیبت کے مینڈک
پھر اپنا سر نکالے بولتے ہیں[۸]

مینڈک یا یوں کہیے فطرت کا خاموش نگران ہماری روزمرہ نظر میں ایک معمولی سا جاندار ہے، مگر حقیقت میں یہ ماحولیاتی توازن کے ایک نہایت حساس اور بامعنی استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ادب میں بعض کردار بظاہر کم زور مگر معنوی طور پر مرکزی ہوتے ہیں، اسی طرح مینڈک بھی قدرتی نظام میں ایک ایسی کڑی ہے جس کی موجودگی پورے ماحول کی صحت کا پتہ دیتی ہے۔

بارش کی پہلی بوند کے ساتھ جب مینڈک کی آوازیں فضا میں گونجتی ہیں تو یہ محض ایک طبیعی ردِ عمل نہیں ہوتا بلکہ ایک زندہ ماحولیاتی اعلان ہوتا ہے کہ زمین ابھی سانس لے رہی ہے۔ مینڈک دراصل ان گنت کیڑوں خصوصاً مچھروں اور فصلوں کو نقصان پہنچانے والے حشرات کو کھا کر ایک قدرتی توازن قائم رکھتا ہے۔ گویا وہ ایک غیر مرئی سپاہی ہے جو انسان کی صحت اور زراعت دونوں کی حفاظت پر مامور ہے، مگر بغیر کسی شور یا دعوے کے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ مینڈک خود بھی اس نظام میں محض "فاعل" نہیں بلکہ "مفعول" بھی ہے۔ وہ پرندوں، سانپوں اور مچھلیوں کی غذا بنتا ہے، یوں غذائی زنجیر میں ایک درمیانی مگر ناگزیر کڑی ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ جائے تو نہ صرف کیڑوں کی تعداد بے قابو ہو سکتی ہے بلکہ ان جانوروں کی بقا بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے جو اس پر انحصار کرتے ہیں۔ اس طرح ایک چھوٹا سا جاندار پورے نظام کی بقا سے جڑا ہوا ہے۔

مینڈک کی سب سے گہری معنویت اس کی حساسیت میں پوشیدہ ہے۔ اس کی جلد ماحول کے ساتھ براہِ راست تعامل رکھتی ہے، اس لیے آلودگی، پانی کی خرابی، اور موسمی تبدیلیاں سب سے پہلے اسی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ یوں مینڈک ایک "حیاتیاتی اشاریہ" (Bioindicator) بن جاتا ہے—ایک ایسا زندہ پیمانہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا ماحول کس حد تک صحت مند یا بیمار ہے۔ اگر کسی علاقے سے مینڈک غائب ہونے لگیں تو یہ محض ایک جاندار کی کمی نہیں بلکہ ایک پورے ماحولیاتی بحران کی تمہید ہوتی ہے۔ ماحولیاتی صحت کے اشاریوں میں مینڈک کی اہمیت کے سلسلے میں مشرقی افریقہ کی یونیورسٹی برائے قدرتی وسائل اور ماحولیاتی سائنس کے ماہر جان اولو (John Oloo) کی ایک تحقیق کے مطابق:

> مینڈکوں اور ٹاڈز (Toads) کی اہمیت میں یہ شامل ہے کہ یہ بعض کیمیائی آلودگیوں کے لیے انتہائی حساس ہوتے ہیں، چاہے وہ مہلک ہوں یا تابکاری سے متعلق ہوں۔ یہ خشک سالی اور موسمیاتی تبدیلی کے لیے بھی حساس ہیں۔ یہ آبی اور زمینی دونوں ماحول میں کیڑوں کے شکاری ہوتے ہیں اور ان کیڑوں کو کھاتے ہیں، جس سے وہ ان کیڑوں کی آبادی کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتے ہیں جو انسانوں میں بیماریوں جیسے ملیریا پھیلانے والے مچھر منتقل کر سکتے ہیں۔ یہ تازہ پانی (freshwater) کے ماحول کے بہترین نمائندے سمجھے جاتے ہیں اور دھاتی آلودگی (metal pollution) کے اشارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات سے بارش کے

قریب ہونے کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ پانی سے زمین تک غذائی اجزا کی منتقلی میں حصہ لیتے ہیں کیوں کہ یہ آبی اور بری دونوں غذائی زنجیروں کا حصہ ہوتے ہیں۔ انہیں حیاتیاتی طور پر مچھروں کے کنٹرول کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔[9]

اردو شاعری ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر جس حیوان کے بارے میں نہایت ہیبت ناک تصوّرات پائے جاتے ہیں، وہ سانپ ہے۔ یہ ایک ایسا جانور ہے جس سے انسانی خوف تقریباً عالم گیر ہے۔ مذہبی اساطیر میں اسے فریب اور شیطنت سے جوڑا گیا، جس کا اثر اجتماعی لاشعور پر آج تک قائم ہے۔ نتیجتاً سانپ کو دیکھتے ہی مار دینا ایک سماجی ردِ عمل بن چکا ہے۔

اردو زبان میں محاوروں اور ضرب الامثال کا جائزہ لیا جائے تو مذکورہ سماجی رد عمل اور اس سے وابستہ احساسات کی جامع عکاسی نظر آتی ہے۔ ''آستین کا سانپ ہونا''، ''سانپ بن جانا''، ''سانپ سونگھ جانا''، ''سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن جانا'' ایسے محاورے سانپ کے بارے میں پائے جانے والے سماجی تصوّرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی ضرب الامثال اور کہاوتیں بھی ان رویّوں کی عکاس ہیں جیسے ''سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''، ''سانپ کا بچہ بھی سانپ ہوتا ہے''، ''سانپ کو دودھ پلاؤ تو بھی زہر ہی اگلتا ہے'' اور ''سانپ کو مارنے سے پہلے اس کی دم سنبھالو'' وغیرہ۔

اردو شاعری کے انتہائی منفی استعاروں کو دیکھا جائے تو سرِ فہرست استعارہ سانپ کا نظر آتا ہے۔ شعرا نے اردو اور متعلقہ زبانوں میں کئی متبادل الفاظ استعمال کیے ہیں، جن میں مار (ہندی الاصل)، ناگ (قدیم و اساطیری رنگ لیے ہوئے)، اژدہا (بڑے اور دیومالائی سانپ کے لیے)، افعی (عربی الاصل، عموماً زہریلے سانپ کے لیے)، ثعبان (کلاسیکی و قرآنی اسلوب میں)، حیّہ (قدیم عربی لفظ)، سرپ (سنسکرت الاصل، ادبی انداز میں)، اور کوبرا (خاص قسم کے سانپ کے لیے مستعمل) شامل ہیں؛ ان میں سے ہر لفظ اپنے سیاق، لسانی پس منظر اور ادبی فضا کے لحاظ سے مختلف معنوی اور تلمیحی پہلو رکھتا ہے۔

سانپ کے کاٹے کی لہریں ہیں شب و روز آتیں
کاکل یار کے سودے نے اذیت دی ہے[10]

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے[11]

اردو شاعری میں سانپ کے بارے میں مذکورہ تصوّرات کے برعکس ماحولیاتی نظام میں اس کے کردار کو ایک نہایت اہم شکاری (predator) کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جو غذائی زنجیر (food chain) کے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ عموماً

چوہوں، مینڈکوں، چھپکلیوں اور دیگر چھوٹے جانداروں کو کھا کر ان کی آبادی کو قابو میں رکھتا ہے، جس سے زرعی فصلیں محفوظ رہتی ہیں اور بعض بیماریوں، جیسے طاعون یا لیپٹو اسپائروسیس، کے پھیلاؤ میں کمی آتی ہے۔ اس طرح سانپ نہ صرف ایک قدرتی کیڑا مار نظام کا حصہ ہیں بلکہ انسانی معیشت اور صحت کے تحفظ میں بھی بالواسطہ کردار ادا کرتے ہیں۔

ماحولیاتی نقطۂ نظر سے سانپ ایک اہم حیاتیاتی اشاریہ (bioindicator) بھی ہیں، کیوں کہ ان کی موجودگی یا کمی کسی علاقے کے ماحولیاتی توازن اور صحت کی نشان دہی کرتی ہے۔ صاف اور متوازن ماحول میں سانپوں کی مختلف اقسام بآسانی موجود ہوتی ہیں، جب کہ آلودگی، جنگلات کی کٹائی، اور مسکن کی تباہی ان کی آبادی کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سانپ خود بھی خوراکی زنجیر میں ایک کڑی ہیں، کیوں کہ وہ بڑے شکاری جانوروں (جیسے عقاب، باز اور کچھ ممالیہ) کے لیے خوراک فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سانپ کا وجود پورے ماحولیاتی نظام میں توانائی کے بہاؤ (energy flow) اور حیاتیاتی تنوّع (biodiversity) کو متوازن رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ کیا سانپوں کی آبادی میں کمی واقع ہو رہی ہے؟ اس خدشے کا اظہار کیا گیا ہے کہ:

> سانپوں کی آبادی میں کمی کیڑوں کی انواع میں اضافہ اور خوراک کے جالوں میں خلل ایسے ماحولیاتی اثرات کا باعث بن سکتی ہے۔"[۱۲]

سانپ کے بارے میں مذکورہ تحقیقی نتائج سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سانپ صرف خطرناک یا خوف کی علامت نہیں بلکہ ایک ضروری ماحولیاتی عنصر ہیں۔ ان کی آبادی میں کمی خوراکی زنجیر میں خلل، کیڑوں کی غیر متوازن بڑھوتری، اور حیاتیاتی تنوّع (biodiversity) میں کمی کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا جدید ماحولیاتی سائنس سانپوں کے تحفظ کو نہ صرف حیاتیاتی بلکہ زرعی اور ماحولیاتی استحکام کے لیے بھی ناگزیر قرار دیتی ہے، اور ان کی حفاظت کو پائیدار ماحول کے قیام کے لیے ایک اہم حکمتِ عملی کے طور پر پیش کرتی ہے۔

سانپ زرعی معیشت کے لیے نہایت اہم ہیں۔ وہ چوہوں اور دیگر چھوٹے جانداروں کو قابو میں رکھتے ہیں جو فصلوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر سانپ نہ ہوں تو چوہوں کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہو جائے، جس سے غذائی قلت اور معاشی نقصان کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ سانپ خوراکی زنجیر کا لازمی حصہ ہیں اور ان کی عدم موجودگی ماحولیاتی عدم توازن کو جنم دیتی ہے۔

سانپ کی طرح چمگادڑ کو بھی انسانی تصوّر میں اکثر آسیب، خوف اور بیماری سے جوڑا جاتا ہے، اور اس کی ایک بڑی وجہ اس کا رات کے وقت متحرک ہونا ہے جو انسان کی روزمرہ دنیا سے مختلف اور قدرے اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اس کا اچانک نمودار ہونا، تیز اور بے ترتیب پرواز، اور گونجتی ہوئی آوازیں انسانی ذہن میں غیر یقینی اور خوف کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی جسمانی ساخت — پروں کی جھلی نما بناوٹ، الٹا لٹکنا، اور چہرے کے غیر معمولی خدوخال اسے ایک عجیب و غریب اور

بعض اوقات بد شگون مخلوق کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ثقافتی اور روایتی قصوں میں بھی چمگادڑ کو اکثر منفی علامت کے طور پر برتا گیا ہے، جہاں اسے تاریکی، تنہائی اور پراسرار قوتوں سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اس کے گرد موجود یہ بیانیہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے، جس نے اس کے بارے میں ایک مشترکہ اجتماعی خوف کو جنم دیا ہے۔ یوں چمگادڑ محض ایک جاندار نہیں بلکہ انسانی تخیل میں ایک علامت بن جاتی ہے—ایسی علامت جو اندھیرے، نامعلوم اور غیر مانوس دنیا کی نمائندگی کرتی ہے، اور اسی وجہ سے اسے شک، خوف اور بعض اوقات بد شگونی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

جب بھی سورج ڈوبتے دیکھا میں خوش ہونے لگا
پر کئی منحوس چمگادڑ مجھے لرزا گئے[۱۳]

جہاں گلزار کھلتا تھا ہنسی کا
وہیں چمگادڑوں کے گھونسلے ہیں[۱۴]

چمگادڑ ماحولیاتی نظام میں ایک نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں، خاص طور پر حشرات کی آبادی کو قابو میں رکھنے میں۔ یہ رات کے وقت بڑی مقدار میں مچھر، مکھیاں اور دیگر نقصان دہ کیڑے کھاتے ہیں، جس سے زرعی فصلیں محفوظ رہتی ہیں اور انسانی صحت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک چمگادڑ ایک رات میں اپنے وزن کے برابر یا اس سے بھی زیادہ کیڑے کھا سکتی ہے، جو اس کے قدرتی کیڑا مار کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے چمگادڑوں کی موجودگی زرعی پیداوار میں اضافہ اور کیمیائی کیڑے مار ادویات کے استعمال میں کمی کا سبب بن سکتی ہے۔

چمگادڑ ماحولیاتی نظام میں پولی نیشن (pollination) اور بیجوں کی ترسیل (seed dispersal) کے ذریعے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر خطِ استوا کے قریبی علاقوں میں بعض پودے اور پھل دار درخت چمگادڑوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ایک اور تحقیق کے مطابق چمگادڑوں کی آبادی میں کمی سے کیڑوں کی تعداد میں اضافہ اور زرعی نظام میں عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے۔ یوں چمگادڑ نہ صرف غذائی زنجیر کا حصہ ہیں بلکہ حیاتیاتی تنوّع اور ماحولیاتی توازن کے تحفظ میں بھی ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

برصغیر کے ثقافتی ماحول میں نحوست کے تصوّر کو جن مختلف علامتوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے، ان میں اُلو ایک نمایاں استعارہ ہے۔ فطری طور پر چوں کہ یہ رات کو متحرک ہوتا ہے تو اسے عموماً ویرانی، تنہائی اور بد شگونی سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے، اور عوامی تصوّر میں اس کی موجودگی کو کسی ناخوشگوار واقعے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اس کی خاموش پرواز اور مخصوص

آواز نے اسے ایک پر اسرار اور خوفناک شبیہ عطا کی ہے، جس کے باعث اس کے گرد منفی تاثر قائم ہو گیا ہے۔ لوک داستانوں، محاورات اور روزمرہ گفتگو میں بھی الو کو اکثر منفی مفہوم میں برتا جاتا ہے، یوں یہ پرندہ محض ایک جاندار نہیں بلکہ ایک علامتی کردار بن کر انسانی تخیل میں نحوست اور بدشگونی کی نمائندگی کرتا ہے۔

اسی ثقافتی تصوّر کے زیرِ اثر اردو شاعری میں بھی الو کا استعارہ عموماً ایک منفی فضا اور بدشگونی کی علامت کے طور پر برتا جاتا ہے، جہاں یہ ویرانی، تنہائی اور شکستگی کے احساس کو گہرا کرتا ہے۔ شاعر جب اس علامت کو استعمال کرتا ہے تو وہ کسی اجڑے ہوئے منظر، ٹوٹے ہوئے خواب یا بکھرے ہوئے وجود کی کیفیت کو ابھارتا ہے، جس میں امید کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور تاریکی غالب آ جاتی ہے۔ الو کی موجودگی اکثر اس فضا کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں انسانی رشتے کمزور پڑ گئے ہوں، خوشیاں رخصت ہو چکی ہوں اور ایک انجانی اداسی ہر شے پر حاوی ہو گئی ہو۔

اس منفی علامت کے ذریعے شاعر قاری کے ذہن میں ایک ایسا منظر نامہ قائم کرتا ہے جہاں خاموشی، خوف اور بدامنی کی کیفیت چھائی ہوئی ہو۔ الو کی آواز کو بھی اکثر کسی ناخوشگوار خبر یا ایسے کی پیشین گوئی کے طور پر محسوس کیا جاتا ہے، جو اس کے استعارے کو مزید گہرا اور اثر انگیز بنا دیتا ہے۔ یوں اردو شاعری میں الو صرف ایک پرندہ نہیں بلکہ ایک ایسا منفی علامتی کردار بن جاتا ہے جو ویرانی، نحوست اور انسانی وجود کی شکستگی کو نمایاں کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

دیوار چمن پر زاغ و زغن مصروف ہیں نغمہ خوانی میں
ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا[۱۵]

لوگ ویرانے میں چھپ جائیں گے مارے خوف کے
بستیوں کے بیچ الو بولتا رہ جائے گا[۱۶]

ماحولیاتی نظام میں الو کا کردار ایک مؤثر شکاری (predator) کے طور پر نہایت اہم ہے۔ یہ بڑی تعداد میں چوہوں، چھوٹے ممالیہ جانوروں اور حشرات کو کھاتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی آبادی قابو میں رہتی ہے۔ اس طرح الو زرعی نظام کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے کیوں کہ چوہے فصلوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ یوں الو ایک قدرتی کیڑا مار نظام کا حصہ بن کر کیمیائی زہروں کے استعمال کی ضرورت کو کم کرتا ہے۔

الو غذائی زنجیر میں ایک اہم کڑی ہے جو ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ نہ صرف خود شکاری ہے بلکہ بعض بڑے شکاری جانوروں کے لیے خوراک بھی بن سکتا ہے، جس سے توانائی کا بہاؤ (energy flow) جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ،

کسی علاقے میں الو کی موجودگی اس بات کی علامت ہو سکتی ہے کہ وہاں کا ماحولیاتی نظام نسبتاً متوازن اور صحت مند ہے، کیوں کہ یہ صرف ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں خوراک اور رہائش کے مناسب وسائل موجود ہوں۔ یوں الو ایک خاموش مگر مؤثر محافظ کی طرح ماحول کے استحکام اور حیاتیاتی تنوّع (biodiversity) کو برقرار رکھنے میں حصہ لیتا ہے۔

جنوبی پنجاب میں کیے گئے ایک مطالعے کے مطابق چھوٹا الو (Athene brama) اپنی خوراک کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ چوہوں اور چھوٹے ممالیہ جانوروں پر مشتمل رکھتا ہے، جس سے یہ قدرتی طور پر نقصان دہ جانداروں کی آبادی کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس تحقیق کے نتائج کے مطابق:

> جنوبی پنجاب میں چتکبرا اُلو (Spotted Owlet) کی خوراک زیادہ تر چوہوں اور دیگر چھوٹے ممالیہ جانوروں پر مشتمل تھی۔ یہ نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ زرعی مناظر میں یہ ایک قدرتی حیاتیاتی کنٹرول عامل کے طور پر اہم کردار ادا کرتا ہے۔[۱۷]

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ جنوبی پنجاب میں الو کی خوراک زیادہ تر نقصان دہ جانداروں پر مشتمل ہے، جس سے اس کی ماحولیاتی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

مشرقی سماج میں حیوانات کے بارے میں منفی بیانیے کے سلسلے میں سؤر کے بارے میں پائے جانے والے تصوّرات محض ایک حیوانی شناخت تک محدود نہیں رہتے بلکہ مذہبی، تہذیبی اور علامتی معانی کے پیچیدہ نظام سے بھی جڑ جاتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم معاشروں میں سؤر کو صراحت کے ساتھ حرام اور ناپاک قرار دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں اس سے متعلق ایک گہری نفسیاتی دوری پیدا ہو گئی ہے۔ یہ دوری صرف خوراک تک محدود نہیں رہتی بلکہ زبان، رویّوں اور سماجی شعور میں بھی در آتی ہے، جہاں ''سؤر'' کا لفظ اکثر گندگی، اخلاقی پستی یا نفرت کے اظہار کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ یوں ایک مذہبی حکم رفتہ رفتہ ایک وسیع ثقافتی بیانیے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

برصغیر اور دیگر مشرقی معاشروں میں سؤر کی شبیہ کو مزید تقویت لوک روایات، حکایات اور روزمرہ محاورات سے ملتی ہے، جہاں اسے عموماً حرص، بے راہ روی اور ظاہری بدصورتی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ یہاں ''گندگی'' کا تصوّر صرف جسمانی نہیں بلکہ اخلاقی اور سماجی سطح پر بھی پھیل جاتا ہے، اور سؤر ایک ایسی علامت بن جاتا ہے جس کے ذریعے ناپسندیدہ اوصاف کو مجسم کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض مشرقی ثقافتوں مثلاً چین یا جنوب مشرقی ایشیا میں سؤر کو مکمل طور پر منفی نہیں دیکھا جاتا، بلکہ کہیں کہیں اسے خوش حالی یا فراوانی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے، تاہم مجموعی طور پر برصغیر اور مسلم مشرق میں

اس کی غالب شبیہ منفی ہی رہتی ہے۔

یوں سؤر مشرقی سماج میں ایک کثیر المعنوی علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جہاں مذہب، ثقافت اور اجتماعی نفسیات ایک دوسرے میں پیوست ہو کر اس کی ایک ایسی تصویر بناتے ہیں جو حقیقت سے زیادہ تصوّر اور روایت کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ تصویر نہ صرف ایک جانور کی سماجی حیثیت کو متعین کرتی ہے بلکہ اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ معاشرے کس طرح بعض اشیا یا جانداروں کو علامتی معنوں میں ڈھال کر اپنے اخلاقی اور تہذیبی تصوّرات کو مستحکم کرتے ہیں۔

مشرقی سماج میں سؤر کے بارے میں جو مذہبی و ثقافتی تصوّر قائم ہے، وہ اردو شاعری میں براہِ راست موضوع تو کم بنتا ہے، مگر اس کے ہم معنی رویّے اور استعارے کثرت سے ملتے ہیں۔ اردو شاعری میں "ناپاکی"، "گندگی"، یا "اخلاقی پستی" کو اکثر سؤر کے لفظ کے بغیر بھی بیان کیا جاتا ہے، یعنی شاعر کسی چیز یا کردار کی پستی کو ایسے استعاروں میں پیش کرتا ہے جو اس سماجی تصوّر کے قریب ہوں۔ اس طرح سؤر کا تصوّر بطور علامت پس منظر میں موجود رہتا ہے، اور شاعر اس منفی تصوّر کو براہِ راست نام لیے بغیر اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

دل کے کیا کرتوت بتائیں یوں سمجھو
اِس مُلا نے سؤر کاٹا ہے بھائی[18]

اس کی نظر میں گویا ہے ملزم ہی مدّعی
سؤر کا بال آگیا منصف کی آنکھ میں[19]

ایسے حیوانات جنھیں انسانی سماج اپنی نفرت، کراہت یا تحقیر کا نشانہ بناتا ہے، فطرت کے نظام میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، اور سؤر بھی انھی میں سے ایک ہے۔ انسانی نظر اس کی ظاہری ساخت، عادات یا سماجی تصوّر پر ٹھہر جاتی ہے، مگر قدرت کے ہاں اس کی حیثیت ایک فعال اور مفید جزو کی ہے۔ یہ زمین پر موجود نامیاتی فضلے، سڑی گلی اشیا اور مردار کو کھا کر نہ صرف ماحول کو صاف رکھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ بیماریوں کے ممکنہ پھیلاؤ کو بھی کم کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اخوان الصفا نے اپنے تمثیلی اسلوب میں سؤر کی زبانی ایک گہری بات کہلوائی ہے کہ اخوان الصفا کے نزدیک حتیٰ کہ وہ حیوانات بھی جنھیں انسان ناپسند کرتا ہے، درحقیقت نظامِ فطرت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور فساد کو ختم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔[20]

یہ نکتہ دراصل ایک بڑے ماحولیاتی اصول کی طرف رہ نمائی کرتا ہے کہ فطرت میں کوئی شے بے کار یا محض منفی نہیں ہوتی۔ سؤر اپنی خوراکی عادات کے باعث نامیاتی مادوں کو دوبارہ مٹی میں شامل کرنے کے عمل (nutrient cycling) میں حصہ لیتا ہے،

جس سے زمین کی زرخیزی برقرار رہتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کی زمین کریدنے کی عادت مٹی کو نرم اور ہوادار بناتی ہے، جس سے بعض پودوں کے بیج اگنے کے لیے سازگار حالات پیدا ہوتے ہیں۔ یوں وہ بظاہر ایک ''گندا'' جانور ہونے کے باوجود زمین کے حیاتیاتی نظام میں ایک فعال کردار ادا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سؤر غذائی زنجیر کا بھی حصہ ہے، جہاں یہ خود بھی بعض شکاری جانوروں کے لیے خوراک فراہم کرتا ہے اور یوں توانائی کے بہاؤ کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا کردار ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ انسانی تعصبات اکثر فطری حقیقتوں سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ اخوان الصفا کا یہ تمثیلی مکالمہ اسی تضاد کو بے نقاب کرتا ہے کہ جسے ہم اپنی نظر میں حقیر اور ناپسندیدہ سمجھتے ہیں، وہی فطرت کے وسیع تر نظام میں ایک ناگزیر اور مفید حیثیت رکھتا ہے۔

اردو کی شعری روایت میں جہاں حیوانات کو منفی، علامتی یا انسانی بحران کے استعاروں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہاں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کلاسیکی عہد میں نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء) کی شاعری ایک مختلف اور نسبتاً زیادہ ماحولیاتی ہم آہنگی پر مبنی تصوّر فطرت سامنے لاتی ہے۔ نظیر کے ہاں حیوانات محض اخلاقی یا سماجی علامتیں نہیں بنتے بلکہ وہ ایک زندہ، متنوّع اور فعال ماحولیاتی نظام کے فطری رکن کے طور پر موجود رہتے ہیں۔ ان کی نظمیں ''چوہوں کا اچار''، ''گلہری کا بچہ''، ''ریچھ کا بچہ'' اور ''اژدہے کا بچہ'' اس امر کی نمایاں مثال ہیں کہ کس طرح حیوانی دنیا کو انسانی برتری یا منفی علامتیت کے بجائے ایک آزاد حیاتیاتی وجود کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے شعری نظام میں حیوانات اپنی فطری جبلت، رویّوں اور وجودی حقیقت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور وہ کسی خوف، بگاڑ یا تہذیبی تنقید کی علامت بننے کے بجائے فطرت کے تسلسل اور توازن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس تناظر میں ان کا تصوّر ایک ایسے ماحولیاتی شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں انسان اور حیوان کے درمیان سخت درجہ بندی موجود نہیں بلکہ ایک وسیع تر حیاتیاتی ربط اور باہمی انحصار کا احساس کارفرما ہے۔ یوں حیوانات یہاں محض مشاہدے کی چیز نہیں بلکہ ماحولیاتی تنوّع اور قدرتی زندگی کے تسلسل کے فعال مظہر ہیں۔

جدید اردو نظم کے منظر نامے پر دیکھا جائے تو ساقی فاروقی (۱۹۳۶ء-۲۰۱۸ء) ایسے شاعر ہیں جن کی نظموں میں ایک ایسے وجودی ماحولیاتی بحران (existential ecology) کی تشکیل نظر آتی ہے جس میں حیوانات مرکزی علامتی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں جانور فطرت کے خاموش باشندے نہیں بلکہ ایک ایسے ٹوٹے ہوئے نظام کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں زندگی، جبلت اور ماحول سب اپنی اصل ہم آہنگی کھو چکے ہیں۔

ساقی فاروقی کی نظموں میں سؤر، کتا، مینڈک اور زخمی بلا جیسے جانور ماحولیاتی اور وجودی کیفیات کے استعارے بن جاتے ہیں۔ یہ جانور ایک ایسے ماحول میں موجود ہیں جو فطری توازن سے محروم ہو چکا ہے اور جہاں بقا، خوف اور طاقت کے تعلقات فطرت کے اصل اصولوں پر غالب آ گئے ہیں۔ اس طرح حیوانات ایک ایسی ماحولیاتی زبان (ecological language) میں ڈھل جاتے ہیں جو انسانی تہذیب کے اندرونی بگاڑ کو ظاہر کرتی ہے۔

ساقی فاروقی کی نظموں کا ماحولیاتی تناظر اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ یہاں فطرت ایک ایسا بکھرا ہوا اور زخمی نظام ہے جس میں حیوانات انسانی تہذیب کے داخلی بحران کی علامتی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی نظم ''ایک سؤر سے'' میں سؤر ایک ایسے ماحولیاتی شعور کی علامت بن جاتا ہے جس میں انسان اور غیر انسان کے درمیان حدیں دھندلا جاتی ہیں۔ یہ جانور ایک ایسے ماحول میں موجود ہے جہاں فطری جبلتیں اخلاقی اور سماجی درجہ بندیوں کے ساتھ الجھ جاتی ہیں۔ ماحولیاتی سطح پر سؤر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فطرت میں موجود ہر جاندار ایک مربوط نظام کا حصہ ہے مگر تہذیبی مداخلت نے اس نظام کو علامتی درجہ بندیوں میں تقسیم کر دیا ہے، جہاں کچھ وجود قابلِ قبول اور کچھ رد شدہ تصوّر کیے جاتے ہیں۔ اس طرح سؤر انسانی داخلی فطرت کے اس پہلو کی نمائندگی کرتا ہے جو تہذیبی دباؤ کے باوجود حیاتیاتی سطح پر موجود رہتا ہے۔ ''ایک سؤر سے'' کا آخری حصہ، اس جانور سے ہزاروں سال پرانی نفرت کے خاتمے کے تجربے سے متعلق ہے۔

وہ جو نفرت کی کمانی
دل کی تہہ میں گڑ گئی تھی
ٹوٹتی جاتی تھی
میرے اندر کی کلیں کھلنے لگی تھی
میں پگھلتا جا رہا تھا
وہ ہماری دوستی۔۔۔
وہ ہماری فتح مندی کا جنم دن۔۔۔
وہ طلسمی دوپہر۔۔۔
۔۔۔سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اگ رہی تھیں[۲۱]

ساقی فاروقی کی نظم ''ایک کتا'' میں کتا ایک بالکل مختلف ماحولیاتی صورت حال کی علامت ہے۔ یہاں یہ جانور ایک ایسے

مصنوعی اور میڈیا زدہ ماحول میں موجود ہے جہاں فطری رد عمل، شعوری بیداری اور جبلتی حساسیت معطل ہو چکی ہے۔ ماحولیاتی تناظر میں یہ نظم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب جاندار اپنے قدرتی ماحول سے ہٹ کر ایک مشینی یا مصنوعی فضا میں داخل ہوتا ہے تو اس کی حیاتیاتی اور جذباتی توانائی بتدریج بے حس ہو جاتی ہے۔ کتا یہاں اس منجمد ماحولیاتی شعور کی علامت ہے جس میں زندگی موجود تو ہے مگر اپنی اصل حرارت اور رد عمل کھو چکی ہے۔

"شیر امداد علی کا مینڈک" میں مینڈک ایک ایسے آبی ماحولیاتی نظام کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی فطری روانی سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ مینڈک جو عموماً نمی، حیات اور ارتقا کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس نظم میں ایک ایسے آبی ماحول میں موجود ہے جو قید اور جبر کی علامت بن چکا ہے۔ ماحولیاتی لحاظ سے یہ صورت حال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آبی نظام بھی اب انسانی مداخلت کے باعث اپنی خود کار زندگی اور ارتقائی تسلسل کھو چکا ہے۔ مینڈک ایک ایسے محصور ماحولیاتی وجود کی علامت بن جاتا ہے جو زندگی اور حرکت کی صلاحیت کے باوجود آزادی سے محروم ہے۔

ساقی فاروقی کی نظموں میں حیوانات ایک مربوط ماحولیاتی نظام کے نمائندے نہیں بلکہ ایک ایسے بکھرے ہوئے اور بحران زدہ نظام کے علامتی اجزا ہیں جس میں فطرت اور تہذیب ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنی اصل شناختیں کھو چکے ہیں۔ سؤر، کتا، مینڈک اور زخمی بلا ایسے حیوانات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جدید انسان نے فطرت کو محض بیرونی طور پر نہیں بلکہ داخلی سطح پر بھی متاثر کیا ہے، اور اب حیوانات محض جاندار نہیں رہے بلکہ اس ماحولیاتی و وجودی بحران کے مختلف چہرے بن چکے ہیں جو انسانی تہذیب کے اندر سے پھوٹ رہا ہے۔

تہذیبی اعتبار سے دیکھا جائے تو مختلف تہذیبی اور ماحولیاتی سیاق میں حیوانات کے معانی یکساں نہیں رہتے۔ ایک ہی جانور کسی خطے میں منفی یا منحوس تصوّر کیا جاتا ہے جب کہ دوسرے خطے میں وہی جانور مثبت، مقدس یا فطری ہم آہنگی کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ فرق دراصل ثقافتی ماحولیاتی شعور (cultural ecological perception) کی پیداوار ہے، جہاں انسان اپنے ماحول، تجربات اور اعتقادات کے ذریعے فطرت کے معنی متعین کرتا ہے۔

مثلاً الّو بہت سے مشرقی معاشروں میں بد شگونی، تنہائی یا موت کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن مغربی روایت خصوصاً یونانی اساطیر اور یورپی علمی روایت میں یہی پرندہ حکمت، بصیرت اور علم کی علامت ہے۔ یونانی دیوی ایتھینا (Athena) کے ساتھ اس کی وابستگی اسے دانش اور فکری روشنی کی علامت بناتی ہے، یوں وہ ماحولیاتی سطح پر رات کے ماحول کا ایک مثبت نگہبان بن جاتا ہے۔

اسی طرح چمگادڑ چینی ثقافت میں خوش قسمتی، طویل عمر اور خوشحالی کی علامت ہے۔ سانپ قدیم یونان میں شفا، طب اور

تجدیدِ حیات کی علامت ہے جیسے اسکلیپئس (Asclepius) کا عصا۔ اسی طرح کئی افریقی اور میسوامریکی ثقافتوں میں سانپ زمین کی توانائی، بارش اور تخلیق کی قوت کی علامت سمجھا جاتا ہے، جو ماحولیاتی نظام میں زندگی کے تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔

کوّا جاپانی اور کچھ مغربی ماحولیاتی و اساطیری تناظر میں ذہانت، موافقت اور بقا کی علامت ہے۔ اس کا کردار اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شہری اور دیہی ماحولیاتی نظام میں کوّا ایک نہایت قابلِ مطابقت (adaptive) جاندار ہے جو انسانی ماحول کے ساتھ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسی طرح بلی کو بعض قدیم مشرقی اور قرونِ وسطیٰ کے یورپی تصوّرات میں جادو، نحوست یا شیطانی قوتوں سے جوڑا گیا مگر مصری تہذیب اور جدید مغربی کلچر میں یہ تحفظ، خود مختاری اور گھریلو توازن کی علامت ہے۔ ماحولیاتی اعتبار سے بلی ایک ایسا جاندار ہے جو انسانی ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر شہری ماحولیاتی نظام کا حصہ بن چکا ہے۔

یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ حیوانات کے بارے میں مثبت یا منفی تصوّرات دراصل فطرت کے بارے میں انسانی رویّوں کی عکاسی کرتے ہیں، نہ کہ خود حیوان کی اصل حقیقت کی۔ ماحولیاتی تنقید کے مطابق جانور اپنی ذات میں نہ منحوس ہوتے ہیں نہ بابرکت، بلکہ وہ مختلف تہذیبوں میں انسانی تجربے، خوف، امید اور ماحولیاتی شعور کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔

اردو شاعری میں حیوانات کے استعاروں کی معنویت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری میں حیوانات کا بیانیہ ایک گہرا تہذیبی، اخلاقی اور نفسیاتی نظام تشکیل دیتا ہے۔ شاعر جب کرگس، سانپ، مینڈک، چمگادڑ یا الو کو اپنے شعری اظہار کا حصہ بناتا ہے تو وہ دراصل ان جانداروں کو ایک علامتی معنی عطا کر رہا ہوتا ہے، اور یہ معنی رفتہ رفتہ اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یوں شاعری کا تخلیقی عمل ایک ایسی معنوی دنیا قائم کرتا ہے جہاں حیوانات اپنی اصل ماحولیاتی حیثیت سے ہٹ کر انسانی صفات، کمزوریوں اور خوف کا استعارہ بن جاتے ہیں۔

دیکھا جائے تو یہی بیانیہ بعض اہم سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا اردو شاعری میں حیوانات کی یہ علامتی تشکیل فطرت کے سائنسی اور ماحولیاتی فہم سے ہم آہنگ ہے، یا یہ اس کے برعکس ایک ایسا تصوّر پیدا کر رہی ہے جو حقیقت کو مسخ کر دیتا ہے؟ جب کرگس کو محض مردار خوری اور اخلاقی زوال کی علامت بنایا جاتا ہے، سانپ کو خالصتاً فریب اور دشمنی سے جوڑا جاتا ہے، یا مینڈک کو محض حماقت اور کراہت کا استعارہ بنا دیا جاتا ہے، تو کیا ہم نادانستہ طور پر ان جانداروں کے بارے میں ایک ایسا منفی بیانیہ مستحکم نہیں کر رہے جو ان کی ماحولیاتی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے؟

یہاں مسئلہ شاعری کے استعارے کا نہیں بلکہ اس کے غیر تنقیدی تسلسل کا ہے۔ ادب کی قوت اسی میں ہے کہ وہ معنی کو

جامد نہیں رہنے دیتا بلکہ نئے تناظرات میں انھیں از سرِ نو تشکیل دیتا ہے۔ اس لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ کیا معاصر اردو شاعری ان روایتی استعاروں کو نئے معنی دینے کی کوشش کر رہی ہے؟ کیا شاعر فطرت کو صرف انسانی جذبات کی توسیع کے طور پر دیکھتا رہے گا، یا وہ اسے ایک خود مختار اور بامعنی وجود کے طور پر بھی قبول کرے گا؟

اس تناظر میں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ کیا ہماری شعری روایت، جو انسانی مرکزیت (anthropocentrism) پر قائم ہے، اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے جہاں اسے ماحولیاتی شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہو گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کرگس کو صرف زوال کا نہیں بلکہ صفائی اور بقا کے استعارے کے طور پر بھی دیکھا جائے، یا سانپ کو محض فریب نہیں بلکہ توازنِ فطرت کی علامت کے طور پر بھی برتا جائے؟ اور کیا اردو شاعری اپنی علامتی روایت کو اس طرح وسعت دے سکتی ہے کہ وہ فطرت کی سائنسی حقیقت سے ہم کلام ہو جائے؟

اردو شاعری میں حیوانات کے استعاروں کے پس منظر میں موجود سماجی بیانیہ ماضی کی انسانی بصیرت کا مظہر ہے، لیکن فی زمانہ وسیع تر علمی تناظرات سے تصوّرات ردِّ تشکیل کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اس بیانیے کو تنقیدی شعور کے ساتھ از سرِ نو دیکھا جائے تو یہ نہ صرف ادبی معنویت کو وسعت دے سکتا ہے بلکہ انسان اور فطرت کے درمیان ایک زیادہ متوازن اور بامعنی تعلق کی تشکیل میں بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۷۰ء) پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد۔ drtariqhashmi@gcuf.edu.pk

۱۔ ارسطو [Aristotle]، *History of Animals*، مترجم: ڈی آرچے وینٹورتھ تھامپسن [D'Arcy Wentworth Thompson] (اوکسفرڈ: کلارینڈن پریس، ۱۹۱۰ء)، ۴۸۸۔

اصل متن:

> In many animals there are traces of psychological qualities, such as gentleness or fierceness, courage or timidity.

۲۔ الجاحظ، کتاب الحیوان، جلد ۱، مرتب: عبدالسلام ہارون (بیروت: دار الجیل، س ن)، ۵۰۔

۳۔ اخوان الصفا، ''رسائل اخوان الصفا''، مشمولہ رسالۃ الحیوان، جلد ۲ (بیروت: دار صادر، ۱۹۵۷ء)، ۳۱۲۔

۴۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ۴۸۶۔

۵۔ ایضاً، ۳۵۵۔

۶۔ آندرے سانتانجلی [Andrea Santangeli] اور دیگر ''The global contribution of vultures towards ecosystem services and sustainability: An experts' perspective''، مشمولہ *Scince Direct*۔

اصل متن:

> Vultures are strongly associated with regulation and maintenance ecosystem services, yet the strength of scientific evidence supporting these services varies across categories.

https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S2589004224011477 تاریخ ملاحظہ: ۱۷ مارچ، ۲۰۲۶ء

۷۔ ظفر اقبال، اب تک، جلد سوم (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۶ء)، ۲۲۲۳۔

۸۔ شارب مورانوی، غزل، شارب مورانوی، ریختہ

دیکھیے: https://www.rekhta.org/ghazals/usii-ghar-men-ujaale-bolte-hain-sharib-mauranwi-ghazals?lang=ur

تاریخ ملاحظہ: ۱۷ مارچ، ۲۰۲۶ء

۹۔ جان اولو [John Oloo] ''Frogs and Toads as Indicators of Ecological Health''، مشمولہ *Journal of Environment*، شمارہ ۴، جلد ۲، (۲۰۲۴ء)، ۵۶-۶۷۔

اصل متن:

> Importance of toads and frogs include sensitivity to some chemical pollutants, lethal, radiation, sensitive to droughts, to climate change, a predator that eats other aquatic and land insects, thus helping to control insects that can transmit diseases to humans such as mosquitoes, good representatives of fresh water environments, indicator of metal pollution and can guide by their behavior the closeness of rainfall, move nutrients from water to land as part of both terrestrial and aquatic food chains, used biologically to control mosquitos.

دیکھیے: https://carijournals.org/journals/JE/article/view/2032/2407 تاریخ ملاحظہ: ۱۷ مارچ، ۲۰۲۶ء

۱۰۔ خواجہ حیدر علی آتش، کلیاتِ آتش، مرتب: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، س۔ن۔)، ۳۹۴۔

۱۱۔ اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب، مرتب: حامد علی خان (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۹ء)، ۱۷۷۔

۱۲۔ سی۔ جے ریڈنگ [C. J. Reading] اور دیگر "Are snake populations in widespread decline?"، مشمولہ *Biology Letters*، جلد ۶، شمارہ ۶، (۲۰۱۰ء)، ۷۷۷-۷۸۰۔

اصل متن:

> Among reptiles, snakes are top predators and therefore a decline in their numbers may have serious consequences for the functioning of many ecosystems.

دیکھیے: https://royalsocietypublishing.org/rsbl/article-abstract/6/6/777/48725/Are-snake-populations-in-widespread-decline?redirectedFrom=fulltext تاریخ ملاحظہ: ۷ا مارچ، ۲۰۲۶ء

۱۳۔ علی اکبر عباس، بر آبِ نیل (لاہور: مکتبۂ فکر، ۱۹۷۸ء)، ۲۶۔

۱۴۔ پرکاش فکری، ایک ذرا سی بارش (کلکتہ: سن فلاور پبلشنگ، ۲۰۰۴ء)، ۱۱۔

۱۵۔ کمال سالار پوری، "وہ ظلمت شب کا غلبہ ہے" غزل، ریختہ

دیکھیے: https://www.rekhta.org/ghazals/vo-zulmat-e-shab-kaa-galba-hai-vo-yaas-ke-baadal-chhaae-hain-kamal-salarpuri-ghazals?lang=ur تاریخ ملاحظہ: ۷ا مارچ، ۲۰۲۶ء

۱۶۔ ظفر زیدی، زخم زخم اجالا (نئی دہلی: شالیمار بکس، ۱۹۸۳ء)، ۲۶۔

۱۷۔ آفتاب اسلم، تنویر حسین ترابی اور محمد خالد افضل "Population Estimation and Behavioral Study of the Spotted Owl (*Athene brama*) in Southern Punjab, Pakistan"، مشمولہ *Journal of Zoology and Systematics*، جلد

دیکھیے: https://www.jspae.com/index.php/jzs/article/view/754/317 تاریخ ملاحظہ: ۷ا مارچ، ۲۰۲۶ء

۱۸۔ تنویر غازی، "لاش پڑی ہے اور سناٹا ہے"، غزل، ریختہ

دیکھیے: https://www.rekhta.org/ghazals/laash-padii-hai-aur-sannaataa-hai-bhaaii-tanveer-ghazi-ghazals?lang=ur

تاریخ ملاحظہ: ۷ا مارچ، ۲۰۲۶ء

۱۹۔ محمد منیر قاسم، تحریر، فیس بک، ۱۹ مارچ ۲۰۲۶ء۔

دیکھیے: https://www.facebook.com/share/p/1AsbRCBS9d/ تاریخ ملاحظہ: ۷ا مارچ ۲۰۲۶ء۔

۲۰۔ اخوان الصفا، "رسائل اخوان الصفا"، مشمولہ رسالۃ الحیوان، جلد ۲، ۳۲۰۔

۲۱۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ۱۳۲۔

Bibliography

Ali Akbar Abbas. *Bar-i-Āb-i Nīl*. Lahore: Maktaba Fikr, 1978, p. 26.

Al-Jahiz. *Kitāb al-Ḥayawān*. Vol. 1. Ed. Abd al-Salam Harun. Beirut: Dar al-Jeel, n.d., p. 50.

Allen's *Indian Mail and Register of Intelligence for British and Foreign India*. London, 11 August 1882.

Aristotle. *History of Animals*. Trans. D'Arcy Wentworth Thompson. Oxford: Clarendon Press, 1910, p. 488.

Aslam. A, Turabi TH, Afzal MK, (2025). "Population Estimation and Behavioral Study of the Spotted Owl (*Athene Brama*) in Southern Punjab, Pakistan." in *Journal of Zoology and Systematics*, Vol. 3(2),45-56 (accessed on 17 March 2026).

Ghalib, Mirza Asadullah Khan. *Dīvān-i Ghālib*. Ed. Hamid Ali Khan. Lahore: Al-Faisal Nashran, 2009, p. 177.

Ikhwan al-Safa. "Rasā'il Ikhwān al-Ṣafā," in *Risālat al-Ḥayawān*, Vol. 2. Beirut: Dar Sadir, 1957, pp. 312, 320.

Iqbal, Muhammad. *Kulliyāt-i-Iqbāl (Urdū)*. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1990, pp. 355, 486.

Khvaja Haidar Ali Atish. *Kulliyāt-i Ātish*. Ed. Syed Murtaza Husain Fazil Lucknawi. Lahore: Majlis Taraqqi-e Adab, n.d., p. 394.

Prakash Fikri. *Ek Zarā Sī Bārish*. Calcutta: Sunflower Publishing, 2004, p. 15.

Reading, C. J. et all, "Are Snake Populations in Widespread Decline?" in *Biology Letters*, Vol 4(2), 2010. p. 777-780

Zafar Iqbal. *Āb Tak*, Vol. III. Lahore: Multimedia Affairs, 2006, p. 2223.

Zafar Zaidi. *Zakhm Zakhm Ujālā.* New Delhi: Shalimar Books, 1983, p. 26.